موجِ کوثر

یعنی

مسلمانوں کی مذہبی اور علمی تاریخ

کا

دورِ جدید

انیسویں صدی کے آغاز سے زمانۂ حال تک

از

شیخ محمد اکرام ایم۔ اے۔ مؤلف غالب نامہ وغیرہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

کلب روڈ، ۱۱-

سلسلۂ کوثر کی یہ تیسری اور آخری کڑی ہے جو ۱۸۰۰ کے آغاز سے لے کر قیامِ پاکستان تک کی اہم مذہبی، فکری اور قومی تحریکوں اور ان کے زعما و قائدین کے حالات و کوائف پر مشتمل ہے۔ یہ دور ہندی مسلمانوں کے لیے انتہائی کشمکش کا دور تھا۔ ان کے سیاسی تنزل کی تکمیل بھی اسی دور میں ہوئی اور ان کے مذہبی احیا، سیاسی ارتقا، ملی نشوونما اور معاشرتی اصلاح کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوا۔ اس عرصے میں ہندی مسلمان اگرچہ سیاسی محکومی اور گوناگوں نامساعد حالات کی زنجیروں میں جکڑے رہے تاہم اس اثنا میں ان کی مساعی سے ٹھوس تعمیری کارنامے بھی ابھر کر سامنے آئے۔ یہ کتاب ان ہی کارناموں کی تفصیلات کو محیط ہے۔

کتاب کے مطالعے سے مسلمانانِ برصغیر پاک و ہند کی گزشتہ ڈیڑھ سو سال کی علمی، تہذیبی، ثقافتی اور اسلامی و ملی تاریخ نکھر کر سامنے آ جاتی ہے اور اس دور کی تحریکوں اور نمایاں شخصیتوں کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ اپنے موضوع میں یہ کتاب انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔

برتی گئی تو اس کا باعث قوم کا "ضعفِ بصارت" یا مسلمانوں کا روائتی "کمزور حافظہ" نہ تھا بلکہ بُنیادی سبب ایک اور تھا۔ سیّد امیر علی نے سپرٹ آف اسلام کے سرورق پر سنائی کا ایک شعر نقل کیا ہے ؎

سخن کز بہرِ دیں گوئی، چہ عبرانی چہ سریانی
مکاں کز بہرِ حق جوئی، چہ جابلقا چہ جابلسا

یہ شعر سیّد صاحب کے اُستاد مولوی کرامت علی جونپوری کو بہت پسند تھا۔ اور فی الواقع اس میں ایک عمیق حقیقت کا بیان ہے، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اس پر عمل کر کے سیّد صاحب نے بہت حد تک اپنا رشتہ اپنی قوم سے توڑ لیا۔ انھوں نے انگلستان میں بیٹھ کر جو کام کیا وہ ہندوستان میں رہ کر نہ کر سکتے تھے اور جب تک ہندوستانی معاملات کی باگ ڈور اہلِ انگلستان کے ہاتھ میں رہی، انگلستان میں ایسے غیر سرکاری سفیر بے حد مفید رہے۔ اور اہلِ مغرب کی غلط فہمیاں دُور کرنے کے لیے انگریزی میں تصنیف و تالیف کی اب بھی بڑی ضرورت ہے، لیکن سیّد امیر علی کی انگریزی کتب دیکھ کر بعض ہندوستانی مسلمان تو کہتے ہوں گے ؎

زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمے دانم

اور ؎

تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ مے دانی　　طپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ بر پارا

ہندوستان کے ان تمام اہلِ قلم کو، جنھوں نے قومی مصلحتوں یا اپنی مجبوریوں کی بنا پر انگریزی کو اظہارِ خیالات کا ذریعہ بنایا ہے، اس کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ دورِ حاضر کے ہندوستانی مسلمانوں کی ادبی اور علمی زبان اُردو ہے اور جو کوئی اسے ترک کر کے کسی اور زبان (مثلاً انگریزی یا عربی) میں تصنیف و تالیف کرے۔ اسے قوم سر آنکھوں پر بٹھائے، لیکن دل میں جگہ نہیں دیتی۔ یہ حال سیّد امیر علی کا تھا اور یہی تلخ تجربہ مسٹر صلاح الدین خدا بخش کو ہوا۔ جن کی پُر مغز اور عالمانہ تصانیف سے بہت تھوڑے مسلمانوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔

بے شک ہر نیک کام اپنا اجر خود ہوتا ہے اور خاص خاص ضرورتوں کے لیے ایک غیر متداول ذریعۂ اظہار بھی اختیار کرنا پڑتا ہے، لیکن جو اہلِ فکر قوم کے دل و دماغ کو متاثر کرنا چاہتے ہیں، انھیں عبرانی و سریانی کو چھوڑ کر اُردو کو اپنی زبان اور جابلقا و جابلسا کو چھوڑ کر پاکستان و ہندوستان کو اپنا دیس بنانا پڑے گا ؎

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا　　نوائے زندگانی نرم خیز است
بہ دریا غلط و با موجش درآویز　　نشاطِ جاودانی در ستیز است

مرزا غلام احمد اور قادیانی جماعت

سرسیّد، مولوی چراغ علی اور سیّد امیر علی نے کئی مذہبی امور کی ترجمانی میں عام مسلمانوں سے اختلاف کیا، لیکن انھوں نے کوئی نیا فرقہ نہیں قائم کیا۔ ان کے طریقِ کار کو جدید علم الکلام یا نو معتزلہ کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اُنھوں نے مسائلِ اسلامی کو جدید فلسفے اور علوم کے مطابق ثابت کرنے کے لیے وہی طریقے اختیار کیے جو اسلامی علوم کو فلسفۂ یونانی کے مطابق ثابت کرنے کے لیے دورِ عباسیہ میں معتزلین یا متکلمین نے اختیار کیے تھے، لیکن اس کے باوجود سرسیّد یا ان کے ہم خیال کسی علٰحدہ فرقے کے بانی نہ ہوئے۔ ان کا مقصد اپنی سمجھ کے مطابق عام مسلمانوں کی اصلاح تھا اور اسی لیے اُنھوں نے اپنے خیالات قوم کے سامنے پیش کیے، لیکن ان میں کوئی مجدّدیت یا نبوت یا ولائت کا دعویدار نہ تھا اور انھوں نے کوئی علٰحدہ جماعت بنانے کی کوشش نہیں کی۔ اسی زمانے میں ایک صاحب پیدا ہوئے جنھوں نے جدید متکلمین کی بعض باتیں اخذ کیں، لیکن جن کی تعلیمات کی امتیازی خصوصیت ان کے ذاتی اور شخصی دعاوی ہیں۔ یہ صاحب قادیانی فرقہ کے بانی مرزا غلام احمد تھے۔

مرزا غلام احمد ۱۸۳۷ء میں پنجاب کے ایک گاؤں قادیاں ضلع گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد والد نے انھیں ڈپٹی کمشنر سیالکوٹ کے دفتر میں ملازم کرا دیا لیکن وہاں اُن کا دل نہ لگا اور چند سال کی ملازمت کے بعد انھوں نے استعفٰے دے دیا۔ سیالکوٹ کے قیام کے دوران میں مذہبی امور سے اُن کی دلچسپی بہت بڑھ گئی اور وہ

اُسکاٹ لینڈ چرچ کے مشنریوں کے ساتھ اکثر بحثیں کیا کرتے تھے۔ ۱۸۷۶ء میں اُن کے والد کی وفات ہوگئی اور وہ ایک طرح سے بالکل آزاد ہوگئے۔ ان دنوں اُن کی حالت نیم مجذوبانہ سی رہتی تھی، لیکن ایسی حالت میں بھی انھوں نے عربی، فارسی اور اُردو لکھنے کی مشق جاری رکھی اور ۱۸۸۰ء میں براہینِ احمدیہ شائع کی، جس میں اختلافی مسائل بہت کم تھے۔ اور جس کے طرزِ استدلال اور جوشِ مذہبی کو عام مسلمانوں نے بہت پسند کیا، لیکن ۱۸۹۱ء میں انھوں نے مسیح موعود اور مہدی ہونے کا دعوےٰ کیا، جس کی وجہ سے اُن میں اور عام مسلمانوں میں اختلاف اور مخالفت کا دروازہ کُھلا۔ مشہور اہلِ حدیث عالم، مولوی محمد حسین بٹالوی نے جو اب تک اُن کے دوست اور شریکِ کار تھے، اُن کے خلاف کفر کا فتوےٰ دیا۔ اور علمائے اسلام، آریہ سماجی اُپدیشک اور عیسائی پادری سب اُن کے خلاف ہوگئے۔ ۱۸۹۲ء میں انھوں نے قادیان سے ریویو آف ریلیجنز شروع کیا اور اُسے اپنے خیالات کی اشاعت کا مؤثر ذریعہ بنایا۔ اب ان کا بیشتر وقت مباحثوں، مباہلوں، پیشین گوئیوں اور تصنیفِ کتب میں گذرتا۔ ۱۹۰۵ء میں انھوں نے اپنی وصیت لکھی اور اپنی جماعت کے مستقبل کے متعلق ہدایتیں دیں۔ ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو جب وہ ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے لاہور آئے ہوئے تھے، ان کا انتقال ہوگیا۔ نعش قادیان میں دفن ہوئی۔

مولوی چراغ علی صاحب سے مرزا صاحب کی خط و کتابت تھی اور جہاد کے متعلق وہ مولوی صاحب کے ہم خیال تھے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کے متعلق انھوں نے بیشتر سرسید کے خیالات کی پیروی کی، لیکن باوجودیکہ اُن کی تعلیمات میں کئی باتیں تو معتزلہ خیالات کے قریب تھیں، وہ اکثر اصولی باتوں میں قدامت پسند تھے اور عام مسلمانوں سے اُن کے معتقدین، بالخصوص قادیانی گروہ کا اختلاف بیشتر مرزا صاحب کے اپنے دعاوی کے متعلق ہے۔ اُنھوں نے مسیح موعود، مہدیٔ منتظر اور کرشن اوتار ہونے کا دعوےٰ کیا اور یہ ایسے دعوے ہیں، جن کو عام مسلمان غلط سمجھتے ہیں۔ نبوت کا دعوےٰ کرکے اور ایک نیا فرقہ کھڑا کرکے انھوں نے مسلمانوں میں جو اختلاف پیدا کیا، اُسے بھی اکثر مسلمان ناپسند کرتے ہیں۔

ان سب باتوں کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُن کی جماعت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اگرچہ مرزا صاحب کی وفات کے چند ہی سال بعد جماعت میں ایک مسئلے پر اختلاف ہوگیا، جس کی وجہ سے کئی قابل اور مخلص لوگ علٰحدہ ہوگئے، لیکن جماعت کے اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ اس میں کوئی نمایاں کمی نہیں ہوئی۔ اس کی ایک بڑی وجہ جماعت کا نظام اور منتظموں کا جوش و ولولہ ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں میں کوئی مذہبی جماعت ایسی نہیں جو اس قدر منظم اور سرگرمِ عمل ہو۔ نئے تعلیم یافتہ لوگوں کو مادیت اور دنیاداری نے عملی کام کے قابل نہیں چھوڑا اور پُرانے علما زمانے کی ضروریات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ایک عالمِ جمود میں ہیں۔ اُن کے مقابلے میں احمدیہ جماعت میں غیر معمولی مُستعدی، جوش، خود اعتمادی اور باقاعدگی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تمام دُنیا کے رُوحانی امراض کا علاج اُن کے پاس ہے۔ یہ اعتقاد غلط ہو یا صحیح، لیکن اس نے اُن کے کاموں میں ایک رُوح پھونک دی ہے جو قادیانیوں کے بعض عجیب و غریب عقائد اور بانی کی بعض شخصی خصوصیات کے باوجود کئی لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

احمدی جماعت کے فروغ کی ایک اور وجہ ان کی تبلیغی کوششیں ہیں۔ مرزا صاحب اور ان کے معتقدوں کا عقیدہ ہے کہ اب جہاد بالسیف کا زمانہ نہیں بلکہ جہاد بالقلم اور جہاد باللسان یعنی تحریری اور زبانی تبلیغ کا زمانہ ہے۔ ان کے اس عقیدے سے عام مسلمانوں کو اختلاف ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج جہاد بالسیف کی اہلیت نہ تو احمدیوں میں ہے نہ عام مسلمانوں میں ؎

طاقتِ جلوۂ سینا نہ تو داری و نہ من!

عام مسلمان تو جہاد بالسیف کے عقیدے کا خیالی دم بھر کے نہ عملی جہاد کرتے ہیں اور نہ تبلیغی جہاد۔ لیکن احمدی جنھوں نے جہاد بالسیف کے معاملے میں کُھلم کُھلا اور صاف صاف حالاتِ حاضرہ کے سامنے سر جھکا دیا ہے۔ دوسرے جہاد یعنی تبلیغ کو ایک فریضۂ مذہبی سمجھتے ہیں اور اس میں اُنھیں خاصی کامیابی ہوئی ہے۔

احمدیہ جماعت لاہور

مرزا غلام احمد کی وفات ۱۹۰۸ء میں ہوئی۔ اُن کے

اُسکاٹ لینڈ چرچ کے مشنریوں کے ساتھ اکثر بحثیں کیا کرتے تھے۔ ۱۸۷۶ء میں اُن کے والد کی وفات ہوگئی اور وہ ایک طرح سے بالکل آزاد ہو گئے۔ ان دنوں اُن کی حالت نیم مجذوبانہ سی رہتی تھی، لیکن ایسی حالت میں بھی انھوں نے عربی، فارسی اور اُردو لکھنے کی مشق جاری رکھی اور ۱۸۸۰ء میں براہین احمدیہ شائع کی، جس میں اختلافی مسائل بہت کم تھے۔ اور جس کے طرزِ استدلال اور جوشِ مذہبی کو عام مسلمانوں نے بہت پسند کیا، لیکن ۱۸۹۱ء میں انھوں نے مسیح موعود اور مہدی ہونے کا دعوے کیا، جس کی وجہ سے اُن میں اور عام مسلمانوں میں اختلاف اور مخالفت کا دروازہ کھلا۔ مشہور اہلِ حدیث عالم، مولوی محمد حسین بٹالوی نے جو اب تک اُن کے دوست اور شریکِ کار تھے، اُن کے خلاف کُفر کا فتوے دیا۔ اور علمائے اسلام، آریہ سماجی اُپدیشک اور عیسائی پادری سب اُن کے خلاف ہو گئے۔ ۱۸۹۲ء میں انھوں نے قادیان سے ریویو آف ریلیجنز شروع کیا اور اُسے اپنے خیالات کی اشاعت کا مؤثر ذریعہ بنایا۔ اب ان کا بیشتر وقت مباحثوں، مباہلوں، پیشین گوئیوں اور تصنیفِ کتب میں گذرتا۔ ۱۹۰۵ء میں انھوں نے اپنی وصیت لکھی اور اپنی جماعت کے مستقبل کے متعلق ہدایتیں دیں۔ ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو جب وہ ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے لاہور آئے ہوئے تھے، ان کا انتقال ہو گیا۔ نعش قادیان میں دفن ہوئی۔

مولوی چراغ علی صاحب سے مرزا صاحب کی خط و کتابت تھی اور جہاد کے متعلق وہ مولوی صاحب کے ہم خیال تھے۔ اسی طرح حضرت عیسےٰؑ کے متعلق انھوں نے بیشتر سرسید کے خیالات کی پیروی کی، لیکن باوجودیکہ اُن کی تعلیمات میں کئی باتیں تو معتزلہ خیالات سے قریب تھیں، وہ اکثر اصولی باتوں میں قدامت پسند تھے اور عام مسلمانوں سے اُن کے معتقدین، بالخصوص قادیانی گروہ کا اختلاف بیشتر مرزا صاحب کے اپنے دعاوی کے متعلق ہے۔ اُنھوں نے مسیح موعود، مہدیِ منتظر اور کرشن اوتار ہونے کا دعوے کیا اور یہ ایسے دعوے ہیں، جن کو عام مسلمان غلط سمجھتے ہیں۔ نبوت کا دعوے کر کے اور ایک نیا فرقہ کھڑا کر کے انھوں نے مسلمانوں میں جو اختلاف پیدا کیا، اُسے بھی اکثر مسلمان ناپسند کرتے ہیں۔

ان سب باتوں کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کی جماعت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اگرچہ مرزا صاحب کی وفات کے چند ہی سال بعد جماعت میں ایک مسئلے پر اختلاف ہو گیا، جس کی وجہ سے کئی قابل اور مخلص لوگ علٰحدہ ہو گئے، لیکن جماعت کے اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ اس میں کوئی نمایاں کمی نہیں ہوئی۔ اس کی ایک بڑی وجہ جماعت کا نظام اور منتظموں کا جوش و ولولہ ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں میں کوئی مذہبی جماعت ایسی نہیں جو اس قدر منظم اور سرگرمِ عمل ہو۔ نئے تعلیم یافتہ لوگوں کو مادیت اور دنیاداری نے عملی کام کے قابل نہیں چھوڑا اور پُرانے علما زمانے کی ضروریات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ایک عالمِ جمود میں ہیں۔ اُن کے مقابلے میں احمدیہ جماعت میں غیر معمولی مُستعدی، جوش، خود اعتمادی اور باقاعدگی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تمام دُنیا کے رُوحانی امراض کا علاج اُن کے پاس ہے۔ یہ اعتقاد غلط ہو یا صحیح، لیکن اس نے اُن کے کاموں میں ایک رُوح پھونک دی ہے جو قادیانیوں کے بعض عجیب و غریب عقائد اور بانی کی بعض شخصی خصوصیات کے باوجود کئی لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

احمدی جماعت کے فروغ کی ایک اور وجہ ان کی تبلیغی کوششیں ہیں۔ مرزا صاحب اور ان کے معتقدوں کا عقیدہ ہے کہ اب جہاد بالسیف کا زمانہ نہیں بلکہ جہاد بالقلم اور جہاد باللسان یعنی تحریری اور زبانی تبلیغ کا زمانہ ہے۔ ان کے اس عقیدے سے عام مسلمانوں کو اختلاف ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج جہاد بالسیف کی اہلیت نہ تو احمدیوں میں ہے نہ عام مسلمانوں میں ؎

طاقتِ جلوۂ سینا نہ تو داری و نہ من!

عام مسلمان تو جہاد بالسیف کے عقیدے کا خیالی دم بھر کے نہ عملی جہاد کرتے ہیں اور نہ تبلیغی جہاد۔ لیکن احمدی، جنھوں نے جہاد بالسیف کے معاملے میں کھلم کھلا اور صاف صاف حالاتِ حاضرہ کے سامنے سر جُھکا دیا ہے۔ دُوسرے جہاد یعنی تبلیغ کو ایک فریضۂ مذہبی سمجھتے ہیں اور اس میں اُنھیں خاص کامیابی ہوئی ہے۔

احمدیہ جماعت لاہور مرزا غلام احمد کی وفات ۱۹۰۸ء میں ہوئی۔ ان کے

بعد حکیم نورالدین پہلے خلیفہ منتخب ہوئے۔ لیکن جماعت کا انتظام صدر انجمن احمدیہ کے ہاتھ میں رہا۔ اگرچہ حکیم صاحب کے زمانے میں اُن کے اثر کی وجہ سے جماعت میں نفاق پیدا نہ ہُوا، لیکن اختلاف کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہ اختلاف ۱۹۱۲ء کے قریب بہت نمایاں ہُوا جب خواجہ کمال الدین نے لندن سے ایک رسالہ مسلم انڈیا اینڈ اسلامک ریویو نکالنا شروع کیا۔ اس رسالے میں خواجہ صاحب نے مولانا ظفر علی خاں کے سیاسی خیالات کی پوری طرح اشاعت کی اور اس کے بعد حادثۂ مسجد کانپور کے متعلق جو شورش ہوئی اس میں بھی حصّہ لیا۔ بعض قادیانیوں کو یہ بات ناگوار گزری۔ مرزا صاحب نے اپنی جماعت کو سیاسیات سے الگ تھلگ رہنے کی تلقین کی تھی اور خواجہ صاحب کا کام بظاہر اس تلقین کے خلاف تھا۔ چنانچہ مرزا بشیرالدین محمود نے اخبار الفضل میں ان کے خلاف مضامین لکھنے شروع کیے۔ وائسرائے کے مصالحانہ فیصلے سے یہ مباحثہ تو بہت دیر جاری نہ رہا، لیکن اختلافات کا آغاز ہو گیا۔ کچھ لوگ مرزا بشیرالدین محمود کے ساتھ تھے اور کچھ لوگ یہ کہتے تھے کہ مرزا محمود مرزا غلام احمد کے صاحبزادہ ہونے کی وجہ سے جماعت کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ چنانچہ جب حکیم نورالدین بیمار پڑے تو ایک جماعت نے یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ حکیم صاحب کے بعد کسی خلیفہ کی ضرورت نہیں۔ صدر انجمن احمدیہ ہی احمدیہ جماعت کا انتظام چلا سکتی ہے، لیکن فریق ثانی نے حکیم صاحب کی وفات کے بعد مرزا بشیرالدین محمود کو خلیفۃ المسیح ثانی چُن لیا اور خواجہ کمال الدین، مولوی محمد علی، مولوی صدرالدین، ڈاکٹر بشارت احمد، مرزا یعقوب بیگ اور اُن کے ہم خیال حضرات قادیانی جماعت سے علیحدہ ہو گئے اور لاہوری جماعت کا آغاز ہُوا۔

لاہوری اور قادیانی جماعتوں کی تفریق بظاہر ذاتیات کے ایک مسئلے پر ہوئی، لیکن اُس ذاتی اختلاف کی تہ میں بھی ایک اصولی اختلاف تھا۔ لاہوری جماعت مرزا صاحب کی معتقد ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ حتے الوسع اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے وابستہ رکھنا اور اُن کے دکھ سکھ میں اُن کا ہاتھ بٹانا چاہتی ہے۔ لاہوری احمدی غیر احمدیوں کو کافر نہیں کہتے۔ غیر احمدیوں کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ مرزا صاحب کی نبوّت کے قائل نہیں بلکہ انھیں حضرت مجدّد الف ثانی اور دوسرے بزرگوں کی طرح ایک مجدد مانتے ہیں

اور احمدیہ عقائد اور عام مسلمانوں کے عقائد میں جتنا کم اختلاف ہو اُسے بہتر سمجھتے ہیں۔ اس لیے خواجہ کمال الدین نے حادثہ کانپور کے متعلق عام مسلمانوں کے ساتھ اتفاق کیا تھا۔ اور بلقان اور طرابلس کے ہنگاموں میں اُن کے نقطۂ نظر کا اظہار کرنے میں پوری قوت صرف کر دی تھی۔ قادیانی بھی اگرچہ اب تبدیل حالات کے ساتھ مسلمانوں کے قومی مسائل میں زیادہ دلچسپی لینے لگے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اپنی علحدہ اجتماعی ہیئت کا بڑا خیال رکھتے ہیں اور اگرچہ غیر مسلموں کی طرح اُن کا تہذیب و تمدن مسلمانوں سے مختلف نہیں، لیکن مذہبی امور میں وہ اُن سے علحدہ ہیں۔ جو شخص مرزا غلام احمد کو نبی نہیں مانتا اسے کافر سمجھتے ہیں اور عام مسلمانوں کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔

لاہوری جماعت احمدیہ کا نظم و نسق انجمن اشاعتِ اسلام لاہور کے ہاتھ میں ہے۔ مولوی محمد علی ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی جنھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مذہب کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی، اس کے صدر تھے۔ اب مولوی صدرالدین امیر جماعت ہیں۔ اس جماعت کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ غالباً دو ڈھائی ہزار سے زیادہ نہیں، لیکن اس کے باوجود اس جماعت نے عملی کام اتنا کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

ایک اہم کام جو یہ جماعت کر رہی ہے، قرآن مجید کی اشاعت ہے۔ بالخصوص انگریزی دان مسلمانوں اور غیر مسلموں میں۔ مولوی محمد علی امیر جماعت احمدیہ کا ترجمہ و تفسیرِ قرآن انگریزی زبان میں پہلا ترجمہ تھا جو کسی مسلمان کے ہاتھوں انجام پایا۔ ترجمے کے علاوہ آپ نے کلام مجید کی مختلف سُورتوں کی تقسیم و ترتیب کر کے اور ان کے مضامین کا خلاصہ دے کر مطالبِ قرآنی کو واضح کیا ہے اور کوشش کی کہ صرف الفاظ ہی پر توجہ نہ رہے بلکہ کلام مجید کے ارشادات اور خیالات بھی وضاحت سے ذہن نشین ہو جائیں۔

آج کل کلام مجید کے متعدد انگریزی ترجمے شائع ہو رہے ہیں، لیکن شرفِ اوّلیت مولوی محمد علی کے ترجمے ہی کو ہے اور گزشتہ رُبع صدی میں انگریزی خوان طبقے کو قرآن سے جو زیادہ دلچسپی پیدا ہوئی ہے، اس کا ایک بڑا سبب مولوی محمد علی کا ترجمۃ القرآن ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی اس ترجمے کی نسبت لکھتے ہیں:-

غالباً اگست ۱۹۳۰ء تھا کہ ایک عزیز کے پاس مولوی محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمۂ قرآن پڑھنے میں آیا۔ اور طبیعت نے اُس سے بھی بہت گہرا اور اچھا اثر قبول کیا۔ مغربی راہ سے آئے ہوئے بیسیوں شبہات و اعتراضات اس ترجمہ و تفسیر سے دُور ہو گئے اور یہ راے اب تک قائم ہے۔ اس بیس سال کے عرصے میں خامیاں اور غلطیاں بہت سی (بلکہ بعض جگہ تو ایسی جسارتیں جن کے ڈانڈے تحریف سے مل جاتے ہیں) اس ترجمہ و تفسیر کی علم میں آچکیں، لیکن انگریزی خوانوں اور مغرب زدوں کے حق میں اس کے مفید اور بہت مفید ہونے میں ذرا بھی کلام نہیں ــــ ہدایت کا واسطہ جب اللہ کی حکمت صریح غیر مسلموں کے کلام کو بنا دیتی ہے۔ تو یہ تو بہر حال اللہ کے کلام کا ترجمہ و حاشیہ ہے۔ مترجم کی بعض اعتقادی غلطیوں کی بنا پر ان کی ساری کوششوں سے بدظن ہو جانا قرینِ انصاف و مقتضائے تحقیق نہیں۔"

انگریزی ترجمے کے علاوہ احمدیہ جماعت اشاعتِ قرآن کے دوسرے مسائل سے بھی غافل نہیں۔ جرمن موجودہ یورپ کی علمی زبان ہے۔ اس میں قرآن مجید کے ترجمے موجود ہیں، لیکن غیر مسلموں کے۔ اب اگر موجودہ یورپ کو اسلام سے صحیح واقفیت دلانی ہے تو ضروری تھا کہ جرمن زبان میں قرآن مجید کا صحیح ترجمہ ہو۔ اور اس میں ترجمے کے ساتھ ساتھ اُن اعتراضات کے جواب بھی ہوں جو قرآن مجید کے بعض اندراجات پر عیسائی کرتے ہیں۔ چنانچہ انجمن نے یہ کام بھی کر دیا۔ اسی طرح شاید جرمن ترجمے سے بھی زیادہ ڈچ ترجمے کی ضرورت تھی۔ جاوا۔ سماٹرا میں قریباً دس کروڑ مسلمان ہیں اور جس طرح ہندوستان میں اعلےٰ تعلیم کی زبان انگریزی ہے۔ اسی طرح جاوا میں یہ مرتبہ ڈچ زبان کو حاصل تھا، لیکن ڈچ میں کلام مجید کا کوئی ترجمہ کسی مسلمان کا کیا ہوا نہ تھا اور چونکہ وہاں دورِ حاضر کے علمی مسائل کو حل کرنے کی ایسی کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ جیسی ہندوستان میں سر سید اور سید امیر علی وغیرہ نے کی۔ اس لیے وہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ مذہب سے روز بروز بیگانہ ہو رہا تھا اور مشنریوں کو دُنیا کے کسی اسلامی مُلک میں اتنی کامیابی نہیں ہوئی، جتنی ڈچ انڈونیشیا (جاوا سماٹرا) میں۔ احمدیہ جماعت نے اپنی بساط کے مطابق

اس فتنے کا مقابلہ کیا۔ ۱۹۲۹ء سے جاوا میں احمدیہ مشن قائم ہے اور مشنریوں کے مقابلے کے لیے جو ہتھیار ہندوستان میں برسوں کی محنت اور تجربے کے بعد تیار ہوئے تھے، وہ اب جاوا کے مسلمانوں کو مل رہے ہیں۔ ڈچ زبان میں دوسری کتب کی اشاعت کے علاوہ کلام مجید کا ترجمہ بھی چھپ گیا ہے اور امید ہے کہ اس سے کسی حد تک تعلیم یافتہ طبقے کی مذہب سے بیگانگی کا سدِّ باب ہو گا۔

قرآن مجید کے تراجم کے علاوہ حدیث اور اسلامی تاریخ کے متعلق بھی احمدیہ جماعت مختلف کتب شائع کر رہی ہے۔ مولانا محمد علی نے مذہبِ اسلام پر ایک نہایت مبسوط اور مفصل کتاب لکھی ہے۔ جرمن، ڈچ، انگریزی، جاوی اور اُردو زبان میں لاہوری احمدیوں نے رسالے جاری کیے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا انجمن نے لاہور سے ایک نہایت بلند پایہ سہ ماہی رسالہ مسلم ریوائول (احیاءِ اسلام) کے نام سے انگریزی میں جاری کیا تھا، جس میں ادبی، سیاسی اور مذہبی مسائل پر نہایت بلند پایہ مضامین درج ہوتے تھے۔ علامہ اقبال نے اس کے لیے کئی مضامین لکھے۔ اگرچہ بعض نامساعد اسباب کے باعث یہ رسالہ بند ہو گیا ہے، لیکن اپنی قلیل مدتِ حیات کے دوران میں اُس نے اسلامی صحافت کا جو بلند معیار قائم کیا تھا، وہ بھی اسلام کی حقیر خدمت نہ تھی۔

تبلیغِ اسلام

قرآن مجید کی اشاعت اور عام مذہبی خدمت کے علاوہ اہم ترین کام جو لاہوری جماعت احمدیہ نے انجام دیا ہے۔ وہ بیرونی ملکوں میں اشاعتِ اسلام ہے۔ جس کی ابتدا اور غیر معمولی کامیابی کا سہرا جماعت کے سب سے کامیاب مبلّغ خواجہ کمال الدینؒ کے سر ہے۔

خواجہ کمال الدین ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ اعلےٰ تعلیم مشن کالج لاہور میں پائی اور اس مخالفانہ مسیحی ماحول میں اسلام کی خوبیاں نمایاں کرنے کی وہ تڑپ پیدا ہوئی، جس نے انھیں بالآخر ایک کامیاب تحریکِ تبلیغ کا بانی بنا دیا۔ اسی زمانے میں جماعت احمدیہ سے منسلک ہوئے۔ ۱۸۹۳ء میں بی۔ اے کی ڈگری لی اور اسلامیہ کالج لاہور میں پہلے پروفیسر اور جلد ہی بعد پرنسپل ہو گئے۔ ۱۸۹۸ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا۔ پشاور میں پریکٹس شروع

کی اور تھوڑے ہی عرصے میں وکلا کی صفِ اوّل میں آگئے۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں لاہور واپس آئے اور یہاں بھی اپنی پوزیشن برقرار رکھی۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں جب طرابلس اور بلقان کی لڑائیوں کی وجہ سے اسلامی ہندوستان سخت بحران کی حالت میں تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہلال وصلیب کی آخری فیصلہ کن جنگ برپا ہے۔ آپ نے دنیوی دولت اور مستقبل کی ترقیوں کو نظر انداز کر کے انگلستان کا رُخ کیا اور اپنی زندگی اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔

خواجہ صاحبؒ سنہ ۱۹۱۲ء میں مولانا ظفر علی خاں کے ساتھ انگلستان تشریف لے گئے تھے اور مولانا کے ساتھ مل کر ایک انگریزی رسالہ مسلم انڈیا اینڈ اسلامک ریویو کے نام سے جاری کیا تھا، جو اب اسلامک ریویو کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ یہ رسالہ سیاسی اور مذہبی معاملات میں اسلامی ہندوستان کی ترجمانی کرتا تھا، لیکن آہستہ آہستہ خواجہ صاحب نے یہ اندازہ لگا لیا کہ تبلیغی کام خود اتنا اہم ہے کہ اگر اسی کے لیے زندگی وقف کر دی جائے اور سیاسی مسائل کو تبلیغی کوشش کے ساتھ جاری رکھ کر تبلیغ کے راستے میں رکاوٹیں نہ پیدا کی جائیں تو یہ بھی اسلام اور ہندوستانی مسلمانوں کی بڑی خدمت ہوگی چنانچہ انھوں نے اس کام پر زیادہ توجہ شروع کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے دیکھا کہ مغرب میں مبلغِ اسلام کا صرف یہی کام نہیں کہ وہ غیر مسلموں کو مسلمان کرے بلکہ مغرب میں مسلمانوں کے متعلق جو غلط فہمیاں صدیوں کے پروپاگنڈے سے راسخ ہو گئی ہیں، انھیں دُور کرنا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

خواجہ کمال الدینؒ نے سنہ ۱۹۱۳ء میں آل انڈیا مُسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے لیے جو پیغام بھیجا، اس میں اُنھوں نے مسلمانوں سے کہا: "ممکن ہے ترکی کے موجودہ مصائب (جنگِ بلقان) کا خاتمہ ہو جائے، لیکن دُنیا میں تمھاری ہستی بطور قوم کے برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ تمھارے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلائی جاتی ہیں، ان کو دُور کیا جائے۔" چنانچہ ووکنگ مشن کا دُوسرا اہم کام ان غلط فہمیوں کی تردید ہے، جو اسلام کے متعلق مغربی ممالک میں عام ہیں۔

احمدیہ مشن کے قیام کے لیے ایک مسجد کی ضرورت تھی۔ انگلستان میں مکانات

بڑے گراں ہوتے ہیں، لیکن خوش قسمتی سے خواجہ صاحب کو بہت روپیہ خرچ کیے بغیر ووکنگ میں لندن سے کچھ دُور ایک مسجد بنی بنائی مل گئی، جو اُن کے مشن کا ہیڈ کوارٹر بنا۔ یہ مسجد ڈاکٹر لائٹنر (Leitner) نے بنوائی تھی جو اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل تھے۔ ڈاکٹر لائٹنر نے سنہ ۱۸۸۵ء میں سر ولیم میور کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے اسلام کے متعلق منصفانہ اور ہمدردانہ لیکچر دیئے تھے اور مسلمانانِ پنجاب کے نظامِ تعلیم پر ایک نہایت فاضلانہ رپورٹ لکھی تھی۔ جب وہ ترکِ ملازمت کے بعد انگلستان گئے تو وہاں انھوں نے ووکنگ میں ایک انسٹی ٹیوٹ کھولا، جس میں ہندوستانی طلبہ کی رہائش کا انتظام کیا۔ طلبہ کی مذہبی سہولت کا خیال کر کے انھوں نے ہندوؤں کے لیے ایک مندر اور مسلمانوں کے لیے ایک مسجد بنوائی۔ جب ڈاکٹر لائٹنر فوت ہو گئے اور یہ سلسلہ درہم برہم ہُوا تو اُن کے ورثا نے مندر کو تو آپس میں تقسیم کر لیا، لیکن مسجد پر ابھی اُنھوں نے قبضہ نہ کیا تھا کہ خواجہ صاحب انگلستان جا پہنچے۔ اُنھوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ جو مسجد ایک دفعہ وقف ہو جائے، پھر شخصی ملکیت نہیں ہو سکتی اور ہمیشہ کے لیے مسجد رہتی ہے۔ مرزا عباس علی بیگ نے جو وہاں انڈیا کونسل کے ممبر تھے، اور سیّد امیر علی نے خواجہ صاحب کی بڑی مدد کی اور (غالباً عدالت سے) اُن کے حق میں فیصلہ ہو گیا۔ یہی مسجد اب ووکنگ مشن کا مرکز ہے۔ یہاں عیدین کی نماز کے لیے سارے انگلستان سے مسلمان طلبہ اور نومُسلم انگریز جمع ہوتے ہیں اور اخوتِ دینی اور اسلامی روحانیت کا ایک رُوح افزا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اِس مسجد کا انتظام اب ایک ٹرسٹ کے ہاتھ میں ہے۔ خواجہ صاحب کی وفات ۲۸ دسمبر سنہ ۱۹۳۲ء کو ہوئی۔ اب ایک اَور صاحب امام مسجد ہیں۔

خواجہ صاحب کی وفات سے مشن کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ مشن کی کامیابی کی بڑی وجہ خواجہ صاحب کی وجیہ شخصیت، علمی قابلیت، مذہبی جوش اور اخلاقی جرأت تھی۔ تاہم مشن کا کام خواجہ صاحب کے وضع کیے ہوئے اصولوں پر چل رہا ہے اور اب بھی ووکنگ مشن ایک اہم قومی ضرورت کو پُورا کرتا ہے۔ لارڈ ہیڈلے مرحوم، سر آرچی بالڈ ہملٹن، سر ہیوبرٹ رینکن، مسٹر ولیم بشیر پکرڈ بی۔ اے (کینٹب)، مسٹر سعید فیلکس ویلائی،

مسٹر حبیب اللہ لوگرو وغیرہ جن لوگوں نے مشن کی تبلیغ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا ہے، ممتاز اور قابلِ قدر ہستیاں ہیں۔ اور اسلام یہ دعوےٰ کر سکتا ہے کہ اگر مشنریوں نے ہندوستان میں غریب یا اَن پڑھ مسلمانوں میں سے چند ایک کو بپتسمہ دے لیا ہے تو اس کے مقابلے میں کئی معزز، تعلیم یافتہ اور قابل عیسائیوں نے اسلام کی حقانیت کا دل و جان سے اعتراف کیا ہے۔

لیکن مشن کے کام کا اندازہ فقط ان افراد کے اعداد و شمار سے نہیں ہو سکتا جنھوں نے اسلام قبول کیا ہے، مشن کا ایک اہم کام اسلام اور مسلمانوں کے متعلق غلط فہمیاں دُور کرنا ہے۔ اس کے علاوہ انگلستان میں ایک مذہبی اور رُوحانی مرکز قائم کر کے مشن نے ان سینکڑوں مسلمان طلبہ کو جو حصُولِ تعلیم کے لیے انگلستان جاتے ہیں، مسیحی اثرات سے بچا لیا ہے۔ مسلمان طلبہ جمعہ کی نماز کے لیے یا کم از کم عید کے موقعے پر اکٹھے ہو جاتے ہیں اور مذہبی جوش تازہ کر لیتے ہیں۔ اس طرح مسلمان طالب علم غیر مسلموں میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود خالص اسلامی اور مذہبی فضا سے دُور نہیں رہتے۔

ووکنگ مشن کا ایک اور فائدہ یہ ہُوا ہے کہ اُس نے دُوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے ہندوستانی مسلمانوں کا واسطہ پیدا کر دیا ہے اور وہ بھی ایسے مقاصد کے لیے جن پر کوئی گورنمنٹ معترض نہیں ہو سکتی۔ ووکنگ مسجد میں عیدین کی نماز کے لیے یا دوسرے اجتماعی موقعوں پر صرف ہندوستانی مسلمان ہی یکجا نہیں ہوتے بلکہ مصر، فلسطین اور دوسرے ممالک کے مسلمان طلبہ بھی آ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے مسائل و مشکلات سے واقف ہو جاتے ہیں۔

احمدیہ جماعت کی تبلیغی کوششیں صرف انگلستان تک محدود نہیں بلکہ انھوں نے کئی دوسرے ممالک میں بھی اپنے تبلیغی مرکز کھولے ہیں۔ دُنیا کے مسلمانوں میں سب سے پہلے احمدیوں اور قادیانیوں[1] نے اس حقیقت کو پایا کہ اگرچہ آج اسلام سیاسی زوال کا

[1] قادیانی جماعت نے بھی ممالکِ غیر میں اشاعتِ اسلام کے کئی مرکز کھولے ہیں۔

زمانہ ہے، لیکن عیسائی حکومتوں میں تبلیغ کی اجازت کی وجہ سے مسلمانوں کو ایک ایسا موقع بھی حاصل ہے جو مذہب کی تاریخ میں نیا ہے اور جس سے پورا پورا فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ اگرچہ جو کام ابھی تک انھوں نے کیا ہے، وہ ایک کامیاب ابتدا سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، لیکن اُنھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے ایک نیا رستہ کھول دیا ہے، جس کے ذریعے وہ اپنے مذہب کی بڑی خدمت کر سکتے ہیں۔ اسلامی ہندوستان اور دوسرے اسلامی ممالک کے درمیان روابط قائم کر سکتے ہیں اور دنیائے اسلام میں وہ سربلندی اور درجہ حاصل کر سکتے ہیں، جس کے وہ اپنی تعداد، مذہبی جوش اور شاندار سیاسی روایات کی وجہ سے مستحق ہیں۔

ندوۃ العُلماء

جدید علم الکلام بالعموم ان شخصوں نے ترتیب دیا، جو عربی اور فارسی کے فاضل تھے، لیکن عام علما کی جماعت سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا۔ اور بالعموم عُلما نے ان کی مخالفت کی۔ مگر آہستہ آہستہ علما میں بھی کچھ لوگ ایسے پیدا ہوگئے جنھیں اس ضرورت کا احساس ہُوا کہ اسلامی مدارس کا نصاب ضروریاتِ زمانہ کے مطابق بنایا جائے اور قدیم علما اور علی گڑھ پارٹی کے بین بین ایک تعلیمی اور مذہبی طریقۂ کار قائم ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں ندوۃ العلما قائم ہُوا۔ اس کے مقاصد حسبِ ذیل تھے:۔

۱۔ نصابِ تعلیم کی اصلاح، علومِ دین کی ترقی، تہذیبِ اخلاق اور شائستگیٔ اطوار۔

۲۔ علماء کے باہمی نزاع کا رفع اور اختلافی مسائل کے ردّ و کد کا پُورا انسداد۔

۳۔ عام مسلمانوں کی صلاح و فلاح اور اس کی تدابیر مگر سیاسی اور ملکی معاملات سے علیٰحدہ۔

۴۔ ایک عظیم الشان اسلامی دارالعلوم کا قیام جس میں علوم و فنون کے علاوہ عملی صنائع کی بھی تعلیم ہو۔

۵۔ محکمۂ افتا کا قیام۔

اس عمدہ خیال کے محرک مولوی عبدالغفور ڈپٹی کلکٹر تھے۔ مگر اس کی تکمیل مولوی سید محمد علی صاحب کانپوری خلیفہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے مبارک